مہاراجے بیٹھتے تھے اور پھر ذرا —

نُوراں کے پاس بہت کم لوگ آتے تھے بلکہ مہینوں کوئی نہیں آتا تھا۔ وہ بہت احتیاط برتتی تھی کہ انہیں، محلے والوں کو علم نہ ہو۔ لیکن ان دونوں کو دیکھ کر وہ سوگئی ہوئی ہری ہو گئی تھی —

بہت دنوں سے اُس نے پیٹ بھر کر روٹی پانی نہیں کیا تھا — مہینوں سے اُس نے کوئی کپڑا تنا نہیں بنایا تھا... یہ آئے تھے اور رات کے اس پہر آئے تھے تو نیکی کے فرشتوں کی طرح آئے تھے۔

مشاہد نے ایک بار راستہ دیکھ لیا تو پھر اُس راستے کو یاد کر لیا۔

باہر بلیک آؤٹ تھا اور ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں میں اندھیرے کے پیوند تھے۔

بابر کو یہ شہر سخت ناپسند تھا۔ اُسے تو پورا ہندوستان اس کے باسی اور موسم اور پھل پھول سب ناپسند تھے... اس کے باوجود وہ ادھر آیا تھا تو پتہ نہیں کیوں آیا تھا۔

شیر شاہ سوری نے بستر مرگ پر مایوسی کا اظہار کیا — لاہور جیسے شہر کو مکمل طور پر تباہ کر دینا چاہئے... جو بھی ہندوستان کی سرحد پار کرتا ہے وہ اس شہر میں اپنے آپ کو ہتھیاروں سے لیس کرتا ہے اور صحت مند سپاہی بھرتی کرتا ہے اور پھر دلی پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ اتنا بڑا اور اتنا اہم شہر دلی کے راستے میں نہیں ہونا چاہیے۔

پہلی بار حملہ آور دلی سے لاہور کی جانب آ رہے تھے۔

باہر اندھیرے کے پیوند آہستگی سے روشن ہو رہے تھے۔ ستمبر کے چاند کی کرنیں اگرچہ مدھم تھیں لیکن اہل لاہور اپنے صحنوں میں سفید پھول رکھتے جھجکتے تھے کہ کہیں دشمن جہاز اندھیرے میں اُن کی سفیدی کا تعین نہ کر لیں۔

اُس صبح مشاہد ایک خصوصی اجازت نامہ حاصل کر کے بی آر بی نہر کے کنارے تک گیا تھا... نہر کے پار ہندوستانی فوج کی نقل و حرکت باآسانی دیکھی جا سکتی تھی۔ انہیں ادھر آنا تھا اور لاہور کے جم خانہ کلب میں ایک پٹیالہ پیگ پینا تھا — وی آنا کے محاصرے کے دوران تُرک کمانڈر نے اپنے مد مخالف کو پیغام بھجوایا تھا کہ کل ہم دوپہر کا کھانا آپ کے ہاں کھائیں گے ذرا مناسب بندوبست کر دیجئے گا۔ شدید لڑائی اور بھرپور حملے کے باوجود وی آنا فتح نہ ہو سکا۔ دوپہر ہوئی اور گذر گئی۔ ادھر سے تُرکوں کو پیغام آیا

کہ آپ آئے نہیں آپ کا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے — جم خانہ کلب لاہور کا بلند اور ہوسوں سے جگمگاتا ہال بھی انتظار کرتا رہا لیکن — اُن کا پیالہ پیگ وہیں کسی میز پر پڑا رہا اور شائد اب تک پڑا ہے۔

بی آر بی کے کنارے — بہت دُھول اور بہت دہشت تھی.. جنگ کا لفظ کسی برسوں کے کھیت کی زردی کو بھی خوف سے بھر دیتا ہے۔

میجر شفقت بلوچ چھوٹے سے قد اور چھوٹی سی داڑھی کے ساتھ مورچے میں سے برآمد ہوا اور وہ مشاہد کی جانب نہیں دیکھتا تھا، نہر کے پار مسلسل دیکھتا تھا اور جب باتیں کرتا تھا تو ایک ایسے جانور کی طرح پریشانی میں کرتا تھا جس کے شکار کے لیے شکاری نے ایک دو نہیں سینکڑوں جال پھیلا رکھے ہوں...

سات کمروں والی کوٹھی کی ویرانی ابھی نئی نئی تھی۔

مردان کاکول اکیڈمی میں زیر تربیت جنٹل مین کیڈٹ تھا اور مشاہد ہر ماہ اس کے پسندیدہ چاکلیٹ اور تاریخ کی کتابیں لے کر ایبٹ آباد جاتا تھا۔ چند لمحے اُس کی اداسی دور کرنے کی کوشش میں، اُسے تسلی دے کر اُسی روز واپس آ جاتا تھا۔

تو باہر ستمبر 65ء کا بلیک آؤٹ تھا۔ اہل لاہور جنگ کے اس ہیجان انگیز کھیل کو انجائے کر رہے تھے، صرف اس لیے کہ یہ کھیل پہلی بار کھیلا جا رہا تھا۔ وہ ابھی تک ایک مکمل جنگ کی مکمل تباہی سے ناآشنا تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جب جنگ دنوں کو عبور کر کے مہینوں اور برسوں میں داخل ہوتی ہے تو کیا ہوتا ہے.. جب لاہور، کراچی اور پشاور کھنڈر ہو جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ ایک محدود جنگ ایک قسم کا جذباتی رومان ہے جس میں آپ کا جذبۂ حب الوطنی بغیر کسی خدشے کے پروان چڑھتا ہے اور آپ وطن کی آزادی کی جنگ میں باآسانی سرخرو رہتے ہیں۔

یہاں لوہاری دروازے کے اس بازار تک سکھ سردار کی بگھی آیا کرتی تھی۔ وہ اترتا تھا اور بگھی واپس چلی جاتی تھی۔ اس جھروکے سے دارو اُس کی خالی بگھی کو جاتے دیکھتی تھی۔

"مشاہد جی —" اس نے اندھیرے میں آواز دی۔ ایک ایسی آواز جس کا چہرہ نہ دیکھا جائے تو اُس میں شدید سپردگی کی خواہش تھی "میں ایک موم بتی جلا لوں؟"

"ہاں —" اُس نے کہا۔

موم بتی کے روشن ہوتے ہی پوری حویلی میں، آشنائی اور شناسائی کی سفید قلعی پھرنے لگی۔ صرف ایک لَو جھروکوں، شیش محل کمروں، فواروں اور اُن پر کھلتی کھڑکیوں کو روشن کرنے لگی۔

"آپ ذرا ادھر بالکونی میں جا کر بیٹھ جاؤ جان —" نُوراں نے سر جھکا کر ایک آنکھ بند کی اور وہ کم روشنی میں بھی نظر آئی کہ اِک ادائے دلبرانہ تھی۔

اسے یہ عمل حماقت آمیز لگا کہ وہ مشاہد علی بیسویں صدی کی ماڈرن ازم کا پروردہ کسی سکھ سردار کی رقاصہ کے بوسیدہ ڈانسنگ رُوم کے اوپر ایک بالکونی میں تن تنہا 1965ء کی جنگ کے دوران ایک بلیک آؤٹ کی رات میں براجمان ہو — لیکن وہ اُٹھا اور چرچراتی لکڑی کی سیڑھیوں پر احتیاط سے قدم رکھتا بالکونی میں پہنچ گیا۔

ناکافی جھلملاتی روشنی میں ایک مختصر کمرے میں، ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں والے تیسری منزل پر واقع کمرے میں — اور دن کے وقت یہاں سے مسجد وزیر خاں کے نکلے مینار دکھائی دیتے تھے وہاں — نُوراں ایک عجیب لباس میں تھی۔ مشاہد نے اُسے کبھی اتنے بھاری سرخ اور مدھم پڑتے گوٹے کناری کے کام والے لباس میں نہیں دیکھا تھا...

نُوراں نے اوپر بالکونی میں اُسے دیکھا جہاں اُس کی دادی ایک سکھ سردار کی نشیلی آنکھوں اور بے ترتیب داڑھی کو دیکھتی تھی اور وہ اُسے — ایک نیلی جین اور نی شرٹ میں دیکھ رہی تھی۔

وہ کوئی عام طوائف نہ تھی — مجرا تو نہیں کرتی تھی — صرف ایک شخص کے لیے ناچتی تھی۔

وہ رقص کے لیے اپنی ایڑھیاں دھیرے سے آہستگی سے اُٹھاتی تھی تاکہ گھنگھرو زیادہ شور نہ کریں.. جیسے ایک مائن فیلڈ میں چلتی ہو۔ آفٹر آل باہر بلیک آؤٹ تھا اور جنگ ہو رہی تھی۔

وزیر آباد کے قریب چھ ستمبر کی نیم گرم دھوپ میں سرسبز چارے کے کھیتوں میں، گنے کی فصل کے قریب کہیں کہیں — آہنی سکریپ کے چند ٹکڑے — اُن میں سے ایک شکستہ مشین گن کی نالی کا رُخ آسمان کی جانب۔ پہلا ہندوستانی جیٹ فائٹر جو ادھر آیا تھا۔ پائلٹ کے خون سے سکریپ کی جستی رنگت نیم سیاہ اُس دھوپ میں جو نیم گرم تھی — مشاہد اُسے دیکھ کر رنجیدہ ہوا۔ تمام جنگوں کا اینڈ ریزلٹ کیا ہے — زیرو پلس زیرو...

کے پیل فیلڈ میں کھیتوں پر دھول کے غبار جن کے اندر لوہے کی مشینیں گندم اور
وڈہ کو روندتی گڑگڑاتی ہوئی چلتی تھیں — ٹکا خان — 65ء — ہیرو — اور پھر 71ء

شا آل دے بچڑز۔

"اوئے — یہ اوپر کس... نے بتی جلا رکھی ہے — بند کرو اوئے۔" نیچے گلی میں
کچھ آوازیں آئیں اور اُن کے اوپر پہنچنے کے ساتھ ساتھ ایک پتھر آیا جس نے اکلوتے
بچی ماندہ رنگین شیشے کو توڑا اور کھڑکی میں یہی تو ایک شیشہ تھا جس نے کبھی دارو کو اور سکھ
سردار کو اس کمرے کی تنہائی میں دیکھا تھا اور اندر وہ پتھر آیا — نُوراں رُک گئی۔ وہ جو
اپنی ایڑھیاں دھیرے سے اور آہستگی سے اُٹھاتی تھی تاکہ شور نہ ہو۔ رُک گئی — خوفزدہ
ہو کر تھم گئی۔

"بتی بند کرو اوئے نہیں تو ہم اُوپر آتے ہیں —" ایک اور دھمکی سے لبریز آواز
سول ڈیفنس کے پُرجوش رضاکار گلیوں محلوں میں گھوم کر ایسی کھڑکیاں تاک رہے تھے
جن کے اندر کہیں غلطی سے یا پوشیدگی سے روشنی ہوتی تھی۔

نُوراں نے اُسی انداز میں، جس انداز میں "میں ایک موم بتی جلا لوں؟" کہا تھا...
اب "میں موم بتی بجھادوں مشاہدی —" کہا۔

"ہاں —" اُس نے کہا — اور پھر اُٹھ کر — اُس چھوٹے سے دَرشنی جھروکے
میں سے اُٹھ کر بوسیدہ کرم خوردہ سیڑھیوں پر پاؤں سوچ سمجھ کر دھرتا اور پھر بھی اُن سے
گر جانے اور اُن کے ٹوٹ جانے کے خدشے اُس کے بدن میں رہتے تھے وہ نیچے آیا اور
اس دوران نُوراں گال پھُلائے موم بتی کے اُوپر جھکی آنکھیں سیڑھیوں کی جانب لگائے کہ
کب وہ بحفاظت اُتر آئے تو میں پھونک مار دوں۔ وہ قریب ہوا تو نُوراں کی پھونک شعلے کو
لرزانے لگی — اور موم بتی گل ہو گئی۔

"مشاہدی —" وہ اندھیرے میں ٹٹولتی ہوئی آگے آئی — مشاہد اُس کی باس کو
پہچانتا تھا کہ وہ اندھیرے میں آگے ہوئی تو وہ جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کتنی قریب ہے "
مجھے ڈر لگتا ہے... اپنا ہاتھ مجھے دو —"

پھر وہ بہت دیر اپنے آپ سے ہی باتیں کرتی رہی... بلاول بٹ کے ہمراہ اُس کا پہلی
بار آنا اور اُس نے چند روز سے پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا تھا — "جان میں نے تمہیں
کبھی گاہک نہیں سمجھا... یہ تو تم جانتے ہو ناں —"

"ہاں —"

"تو جان ناراض نہ ہونا —" اندھیرے میں اب بھی مشاہد آگاہ تھا کہ وہ فاصلے پر ہے" تمہیں تین برس ہو گئے ہیں میرے پاس آتے ہوئے — تو تمہیں خواہش نہیں ہوئی — ہیں؟"

مشاہد کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔

"میں ذرا وذیری ہوں — لیکن اتنی بھی نہیں — ہیں؟"

مشاہد پھر خاموش رہا۔

"مشاہد جی میں رانی ہوں اِس حویلی کی — ابھی فیصلہ ہونا ہے — میری داد یہاں راج کرتی تھی"

کھڑکی کا آخری شیشہ فرش پر کرچیوں کی صورت میں تھا... یا ہو گا — کہ دکھا نہیں دیتا تھا... اور ان میں — ان کرچیوں میں جانے کیا کیا صورتیں تھیں جو پنہاں ہو گئیں اور جو چوکھٹے اور خلاء تھے کھڑکی کے — اُن کے باہر لاہور کے بلیک آؤٹ آسمان میں بہت دیر دیکھنے سے مسجد وزیر خان کے مینار شانے سے دکھتے تھے۔ نیلے نین نقش والے مینار اب سرمئی دکھتے تھے۔

تو اب جیسا کہ آغا حشر کے ڈراموں میں بدلتا ہے تو منظر بدلتا ہے۔

یہ وہی آغا صاحب ہیں کہ اگر آپ چوک مزنگ سے چوبُرجی کی جانب سفر کرتے ہیں، آپ کے دائیں بائیں آگے پیچھے اہل وطن بھی ایک بھگدڑ کے عالم میں سفر کرتے ہیں تو رُکتی اور بمشکل بحال ہوتی ٹریفک کی غلیظ دلدل میں اپنے آپ کو شدید گرمی میں کوستے، یعنی اگر گرمیوں کا موسم ہے تو، جب آپ میانی صاحب قبرستان کی گذرتی قبروں کو دیکھتے ہیں تو وہیں ایک لوح پر موصوف کا نام دیکھتے ہیں... اور نقل کتبہ کتبہ باشد...

مزار پُرانوار جناب آغا سید محمد شاہ صاحب
المعروف انڈین شیکسپیئر حضرت آغا حشر کاشمیری
28- اپریل 1935ء
"اظہار حقیقت مبنی بر حقیقت"

ایک اک تمثیل تیری وقت کا تھی شاہکار
پھر گئی تیری دہائی مچ گئی تری پکار
تیری تصنیفات کے اوصاف آئینے بے شمار
لکھنے بیٹھوں میں تو صبح حشر بھی ہو آشکار
پھر بھی نظم و ضبط سے باہر ہو جولانی تیری
بند سے باندھی گئی کب حشر طغیانی تیری

منشی دل لکھنوی

توجناب آغا حشرؔ شائل منظر بدلتا ہے اور 65ء کے بلیک آؤٹ سے براہ راست ...اہ پرواز کرتا ہوا 92ء میں آ جاتا ہے۔ کردار وہی رہتے ہیں۔ وقت بدلتا ہے یا کرداروں ...چہروں کی جھریاں اور دانت اور باقی رہ جانے والی زندگی کے مہ و سال بدلتے ہیں — ...لال حویلی کا سیٹ تقریباً وہی رہتا ہے صرف گرگابیاں اور کاریگروں کے چہرے اِن ہو ...تے ہیں۔ مسجد وزیر خان کے مینار بھی خالی چوکھٹوں میں ہیں... اور ایک چوکھٹے کا آخری ...ہ جس نے سکھ سردار کی پگڑی کے رنگ جذب کئے تھے 65ء کے بلیک آؤٹ پتھر کی زد ...آ کر کرچی کرچی ہوئے اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ اُس ڈانسنگ روم میں کہ جس میں دارو ...ں کرتی تھی فرش پر اُس کا ایک ذرہ ایک شائبہ بھی موجود نہ تھا۔ اگر ایک کرچی بھی ...لی اُس میں سکھ سردار کی رنگین پگڑی کے رنگ لشکارے مارتے۔ تو ہم 92ء میں آ ...تے ہیں۔

"ہیں مشاہد جی یہ کیا کہہ رہے ہو — چوڑی سے شادی کرو گے؟" ابھی تک اس ...ایستادگی میں ایک شاہانہ پن تھا۔ حُسن کے تکبر کی جھلک تھی جس میں جھریوں میں ...گئی ہوئی آنکھیں اور حلقے تھے... راکھ بھرے ہاتھ تھے اور پچاس گرگابیوں کی ایڑھیاں ...جن سے روز کا دانہ پانی چلتا تھا۔

"مجھے برگیتا چاہیے —"

"چاہنے کے لئے شادی کرنا ضروری ہے؟"

"ہاں —"

"اتنی حیاتی آپ نے یونہی گزار دی ہے۔ اب ادھیڑ عمر میں آئے ہو تو شادی کرنا

چاہتے ہو... اور وہ بھی... ناں ہے تو چُوڑی ناں —"

پہلی بار جب شہر میونخ میں نہیں شہر لاہور میں کرسمس تھی ظفر علی روڈ کے اُس پُر آسائش گھر میں... کچی آبادی اور ریلوے لائن کے ساتھ ابھی ابھی راڈنی ایزبرگ العروف لپو — ساؤدھا یسوع اج آیا سی، گا چکا تھا اور باہر کچی دیواروں پر بارش گرتی تھی اور خاموش ہوتی تھی ایک سیاہ فام پگڑی باندھے سوکھے اور بے توقیر شخص کی بھیگی ہوئی مونچھیں — جیسے ابھی جوہڑ میں سے نکل کر آیا ہو... کیچڑ بھرا — بے چارہ اور کمینہ — صاحب جی۔ گریب آدمی ہوں میری جنانی نے یکدم اکو واری تین بچے جن دیئے ہیں —

اُٹھو مشائلہ انہیں دودھ پلاؤ۔ مقدس باپ نے تمہیں دو بچوں کی ماں بنا دیا ہے۔

وہ کالٹو مالٹو سیاہ بدہیئت چیتھڑے ایک زبردست فرانسیسی سائن کی جھالروں والی Cot میں پڑے مشائلہ کے ہاتھوں سے دودھ پیتے رہے اور متعدد فیڈر پینے کے باوجود اُن کے پیٹ بڑے نہ ہوتے تھے اُسی طرح چپکے رہتے تھے۔ چند دنوں بعد جب اُن کے سانس چلنے لگے تو وہی سوکھا اور بے توقیر شخص آ گیا صرف اس بار اُس کی سفید مونچھیں بھیگی ہوئی نہیں تھیں کہ باہر بارش نہیں تھی، تیز دھوپ تھی اور وہ ہاتھ جوڑ کر منتیں کرنے لگا — صاحب جی، ان میں سے ایک کاکا ہے، یہ مجھے واپس کر دو — میرا ہاتھ بٹائے گا جھاڑو پکڑ کر صفائی ستھرائی کرے گا۔ لوگوں کے کوٹھے اُتارے گا — باقی کاکی کو بناشک آپ رکھ لو۔"

مشائلہ یقین نہ کر سکی کہ کوئی بھی شخص چاہے وہ کامونکی کا رہنے والا ہی کیوں نہ ہو کیسے اپنے دو بچوں میں صرف بیٹے کی بازیافت میں دلچسپی رکھ سکتا ہے۔

چند ماہ بعد راڈنی ایزبرگ اپنی پوتر تا اور اپنے سچ کی آخرت میں یقین رکھتا ہوا مشائلہ اور اُس ابھی تک سیاہ بدہیئت چیتھڑے کے ساتھ سویڈن واپس چلا گیا۔

پانچ برس بعد جو تصویر دریائے یوٹا کے کنارے بیٹھے ہوئے ایزبرگ خاندان کی مشاہد کے لیٹر بکس میں سے کرسمس کے دنوں میں ہی برآمد ہوئی اُس میں راڈنی۔ مشائلہ اور اُن کے دو موٹے تازے بچوں کے علاوہ ایک حیران اور بڑی بڑی آنکھوں والی سیاہ بلکہ کوئلہ سیاہ بچی بھی تھی — وہ اب ایک چیتھڑا نہ تھی۔ ایک بچی تھی۔

اور کافی برس بعد جب مشاہد ایک ٹیکسٹائل فیئر میں شرکت کے لئے یونے بورگ گیا... شام کو مختلف کمپنیوں کے بروشر اور اشتہاری پمفلٹ اور ٹیکسٹائل سے متعلق

اُٹھائے ہانپتا ہوا اپنے ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا تو اُسے خیال آیا کہ یہاں
کے اس ساحلی شہر میں راڈنی ایزبرگ عرف لیو بھی رہا کرتا تھا اور وہ ایک زمانے میں
کا عزیز از جان دوست بھی رہا تھا... یہ خیال ظاہر ہے اُسے یک لخت نہیں آیا تھا —
اُس کے ساتھ رہا تھا۔
اس نے فون اُٹھا کر انکوائری سے ایزبرگ کا نمبر دریافت کیا — اور یہاں ہزاروں
ہیں تو پہلا نام کیا ہے — راڈنی — جواب آیا راڈنی بھی بے شمار ہیں لیکن ہم
کرتے ہیں۔

دریائے یوٹا کے کنارے ایک بے آرام کرنے والے سرد اور دُھند بھرے موسم
ہی ٹھنڈے لینڈ سکیپ میں ایک ایسا گھر تھا جس کے اندر مشرق کے رنگوں کی گرمی

راجستھانی پگڑیاں۔ فیکٹریوں میں وسیع پیمانے پر تیار ہونے والی راجپوت اور مغل
ایجز۔ پیتل کی دیویاں۔ اونکس کی ایش ٹریز۔ اونٹ کی کھال کے بد وضع لیمپ۔
میزیں اور سندھی رَلیاں... ایک پوری دیوار موٹے شیشے کی تھی جس پر کہر جمتی تھی
سامنے کے منظر کو دھندلاتی تھی اور سامنے کے منظر میں بھی ایک سرد لینڈ سکیپ کے
دریائے یوٹا جیسے منجمد ہونے کو تھا۔
"ہائی فرینڈ —" راڈنی کی داڑھی راسپوٹین کے ہم پلہ ہو چکی تھی اور اُس کی
کے گرد مہ و سال کے حلقے تھے اور دانت جو پہلے ہی زردی مائل تھے اب بوسیدہ
آتے تھے۔

"مشائلہ کہاں ہے؟"
"ہا — مشائلہ" راڈنی نے ایک ہچکی بھری "وہ ذرا دیر سے گھر آتی ہے۔ لیکن
موجود ہے اور وہ جانتی ہے کہ تم آ رہے ہو۔ ہم نے اسے تھوڑی سی پنجابی اور اُردو
ہے جتنی ہمیں آتی تھی... دونوں بچے سو چکے ہیں۔ لیکن — میرا خیال ہے کہ
وقتوں کی یاد میں تم ہمیں اتنا وقت تو دو گے کہ ہم اکٹھے ڈنر کر سکیں... تم میرے پہلے
دوست ہو —"
سوئیڈز کا بس چلے تو وہ اپنی ہچکیوں کے زور سے بجلی کو نیست و نابود کر دیں اور

سرف موم بتیوں کی روشنی میں پوری زندگی ہنسی خوشی گزار دیں۔
سوئیڈزیوں بھی نیم تاریکی کے پجاری ہیں...
راؤنی نے ڈائننگ ٹیبل پر پانچ موم بتیوں کو روشن کیا اور پھر تمام لائٹیں آف کر دیں۔

وہ بہت دیر تک اور بہت غیر ضروری تفصیل کے ساتھ پاکستان میں عیسائیت کے اپنے فرقے کے پھیلاؤ کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ میز پر خوراک کی ورائٹی حیرت انگیز تھی... اس کا جواز راؤنی کے پاس موجود تھا۔ مشائلہ نے پچھلے ایک برس میں مختلف دعوتوں اور تہواروں کے موقع پر اپنی مشرقیت ثابت کرنے کے لئے تیز مصالحوں والے پاکستانی کھانے تیار کئے تھے اور اُن میں سے کچھ بچا کر اُن کے پیکٹ بنا کر فریزر میں محفوظ کر لیتی تھے — اِن میں بینگن گوشت بھی تھا جو مشاہد نہایت رغبت سے کھا رہا تھا جب برگیتا ہال نما کمرے میں جہاں شیشے کی دیوار کہر آلود ہو رہی تھی اور اُس کی ٹھنڈک بدن میں سرائت کرتی بے آرام کرتی تھی — داخل ہوئی۔

دریائے یوٹا کے یخ اور آلودہ پانی کہ وہاں بندرگاہ میں درجنوں ٹرالر — آئل ٹینکر اور کارگو کیریئر اپنی آلودگی انڈیل رہے تھے، اندر اس شیشے کی دیوار کے اندر راؤنی ایزبرگ کے گھر کے اندر یہ پانی اتنی آہستگی سے داخل ہوئے جیسے وہ بھی ذرا پر مدعو تھے۔ صرف مشاہد نے انہیں دیکھا، مشرقی دستکاریوں اور گوڑھے رنگوں کے درمیان وہ پانی رواں تھے اور اُن کے درمیان برگیتا کا سیاہ جسم تھا جو اُس نے دیکھا جو اُس تک بہتا ہوا آیا۔ اُس کی یخ بستگی میں سے اُس لمحے بھاپ اُٹھتی تھی جب وہ اُن کے پس منظر میں چلتی ہوئی آئی۔ کھڑکی سے باہر سلیٹی اور سیاہ لینڈ سکیپ میں کوئی سفید شگوفہ نہ تھا جو اس کی گود میں گرتا۔

یہ وہی چیتھڑا ہے — پچیس برس پہلے کا — ظفر علی روڈ کی رات میں برستی بے آواز بارش میں ایک بے حیثیت گیلی مونچھوں والے شخص کی اولاد — کیا وہی اُس کے سامنے ہے جسے وہ دیکھتا چلا جا رہا ہے ایک بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں...

وہ اُٹھا اور اس کی جانب بڑھا اپنا ایک ہاتھ کسی پنجابی بزرگ کی طرح آگے کیا اُس کے سر پر پیار دینے کے لئے کہ اس عمر کی لڑکیوں کو ایسے ہی شفقت اور بزرگی پیار دیتے ہیں اور پھر وہ رک گیا — اُس کے جذبات کا دھارا بالکل مخالف سمت کو بہہ تھا — وہ رُک گیا۔

برگیتا نے مڑکر اپنے باپ — راؤنی ایزبرگ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور
لیا جس کا ترجمہ راؤنی نے آسان اردو میں کر دیا" میری بیٹی... یسوع کی یہ پاکستانی
ہے کہ..." وہ ایک پاکیزہ ہنسی ہنسا "اس شخص کا رنگ مجھ جیسا ہے —"

"ایک چوُڑی سے بیاہ کروگے مشاہد چوہدری جی —"
مشاہد بہت دیر چپ رہا۔ وہ مشورہ کرنے آیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ نوُراں ایک
بزرور کی حیثیت سے درست رائے دے گی لیکن واضح طور پر وہ بھی ایک پارٹی

"برگیتا ایک سویڈش لڑکی ہے۔ مکمل طور پر۔ وہ... اُس نے تو پاکستان دیکھا بھی

"پر ہے تو کاموئکی کے چوُڑے کی بیٹی مشاہد جی۔ چاہے سویڈن میں کھاپی کے جوان
۔ کن بکھیڑوں میں پڑ گئے ہو۔ عشق تو کوئی چیز نہیں —"
"ہے —" اُس کی آواز میں اتنی سختی اور قطعی آخریت تھی کہ نوُراں ڈر گئی
۔مجھے برگیتا چاہئے"
اب تک لال حویلی کی ملکیت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ پہلے اکبری منڈی کے ایک
نے اُسے گرم مصالحے، ہلدی اور مرچوں کے گودام کے طور پر کرائے پر حاصل کیا
راہی نئے مالکوں کو چند متمول موچیوں نے دوگنا کرایہ آفر کر دیا۔ اب وہاں
بنتی تھیں اور اُسے فیکٹری کہا جاتا تھا.... نوُراں کی "گاہکیاں" اختتام پذیر ہوئے
رچکی تھیں... وہ اپنے پیشے سے مطابقت رکھتے ہوئے فکر فردا سے آزاد رہی...
ائم ہوئی تو کچھ ہاتھ پلے نہ تھا... کوئی ٹھکانہ نہ تھا... چنانچہ روزانہ چالیس پچاس
لی کی ایڑھیاں جرمن سریش کے ساتھ اور روٹی پانی کا بندوبست۔ نوُراں سر جھکائے
ںکے گرد حلقے اور کم دانتوں والے منہ پر جھریاں بھرے ہونٹ لٹکتے ہوئے... بس
بار مشاہد جی آجاتے۔
کاریگر جن میں سے بیشتر چمار تھے اُسے شک کی نظروں سے دیکھتے کیونکہ جب وہ
تا تو اُس کی پشت سے قطعی طور پر عمر کا اندازہ نہ ہوتا تھا اور جوان کاریگر ایک بار تو
لما کر اپنے بدن کو اینٹھتا ہوا محسوس کرتا تھا۔

"جے فیصلہ کر کے آئے ہو مشاہد جی تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو ـــ بسم اللہ"

"عشق چیز ہے ـــ" مشاہد کی آواز بہت بھرائی ہوئی تھی کہ اُس کے سامنے بڑ
کی سیاہ جنبش اور بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔

"ہو گی ـــ" راکھ بھرے ہاتھوں نے اپنے آپ کو جھٹکا۔

یہ جو سیاہ اور پوشیدہ آنکھوں والیاں ہنستی تھیں اپنے برقعوں کے پلّوں میں لو
جن کے چھریرے بدن ابھی پھوٹتے تھے ـــ زور لگا کر ـــ موسم آنے سے بہت پہلے
ـــ ٹہنیوں میں سے اُبھرتے ہوئے... تو یہ اندرون شہر کی نیم خواندہ لاہورنیں تھیں اور ا
کے دلوں کے اندر ہی اندر عشق شاہ حسین والی دھمال ڈالتا تھا اور یہ وہی کھوئیاں تھیں
جہاں سے عاشق پانی بھرتے تھے۔

پر نہیں ـــ ایک اور کھوئی بھی تھی جہاں سے مشاہد پانی بھرنا چاہتا تھا۔

جنہاں کھوئیاں تے بھرن معشوق پانی ـــ

برگیتا۔

دونوں باجیوں پر فی الفور اور بیک وقت غشی کے دورے پڑ گئے۔

غش کھانے سے پیشتر انہوں نے اپنے سینوں پر دوہتڑ مار کر بین کئے "ہائے ہا
چوہدری اللہ داد کا بڑا بیٹا ـــ ہمارا بھائی اور ہائے ہائے ـــ چوڑی کو گھر لا رہا ہے ـــ"

مناسب وقفوں کے بعد وہ غشی سے ہوش میں آتیں، متعدد ٹشوز گیلے کرنے
بعد سیون اپ یا کوکا کولا کی ایک ایک بوتل پینے کے بعد پھر بے ہوش ہو جاتیں۔

آہستہ آہستہ اُن کے لئے مزید غش کھانا ممکن نہ رہا اور وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ
چارپائیوں پر آلتی پالتی مارے سیپارہ پڑھنے والے بچوں کی طرح آگے پیچھے ہلتی بین کر
لگیں... اور دیر تک کرتی رہیں...

مردان کراچی سے لاہور آنے والی سست ترین ٹرین میں بیٹھا ہچکولے کھاتا، دھول
پھانکتا اپنے آپ میں ہنس رہا تھا، خوش ہو رہا تھا... بھائی جان... حیران پریشان اور جنگ
بیابان... بالآخر... ایک عدد بھابھی اور وہ بھی سویڈش ـــ پاک سرزمین شاد باد!

برگیتا ایک عجوبہ تھی۔

یوٹے برگ میں سیاہ رات جیسی سیاہ وہ بچی جس کے نین نقش آسڑو منگولائیڈ تھے
بچوبہ تھی... بلکہ ایک غیر فطرتی چیز تھی کہ سویڈن میں ہر شے ہر رنگت سفید اور بے
تھی، اُن کی مڈسمر نائٹس بھی سفید تھیں۔

وہ ہمہ وقت مانگ میں رہتی — ایک گڈلک چارم کے طور پر۔ دوسرے بچوں
کے ساتھ کھیلنے کے لئے ایک سیاہ گڑیا کے طور پر — اور ایک سیاہ فام کے لئے سفید فیاضی
کے مظاہرے کے طور پر۔

کہیں نہ کہیں کوئی شدید گڑبڑ تھی جو اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اُس کے ماں
باپ ویسے ہی تھے جیسے سب بچوں کے تھے لیکن وہ سب بچوں جیسی نہ تھی — اور اس
کے علاوہ اس کے دو چھوٹے بھائی بھی ویسے ہی تھے جیسے سب بچے تھے لیکن وہ نہ تھی —
ویسی نہ تھی — بس یہی گڑبڑ تھی۔

پہلی بار جب اُس کے بچپن کا بند اندر کی رطوبتوں سے ٹوٹا تو مشائلہ نے اس کا
حوصلہ بندھاتے ہوئے... اُسے زندگی کے حقائق بتاتے ہوئے جنہیں وہ بہت عرصے سے
جان چکی تھی پہلی بار اس کے سیاہ وجود کا سبب بتایا — تم پاکستانی ہو — تمہارے ماں
باپ... اور میں اور پاپا تمہیں بے حد چاہتے ہیں...

وہ بہت دن سو نہ سکی۔ اُس کی خصلت میں تشدد نے زور پکڑا۔ سکول سے
شکایتیں آنے لگیں... وہ ایک وحشی نیگرس کی طرح Behave کر رہی تھی۔

اگر یہ میرے ماں باپ نہیں ہیں تو میں یہاں کیوں ہوں — اُن کے پاس کیوں
نہیں ہوں —

راؤنی اپنی داڑھی کھجلاتا بہت مدبر دکھائی دینے کی کوشش میں اُسے سمجھاتا کہ ادھر
بہت دشواری اور تنگی ہے۔ تمہارا باپ — ایک سویپر ہے اور تمہارے بہن بھائی لوگوں کا
گند جمع کرتے ہیں اور تم اب وہاں نہیں رہ سکتیں اور تم بہت اچھے نصیب کی ہو کہ یہاں
ہمارے پاس سویڈن میں ہو اور ہم تمہیں اپنی سگی بیٹی سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

بہت ادب کرنے والی اور ازحد دھیمی بچی میں تشدد اور نافرمانی کی جڑیں گہری ہو
گئیں۔ وہ اب راؤنی اور مشائلہ پر چیختی تھی اور دیر سے بہت دیر سے گھر آتی تھی —
کبھی نہیں بھی آتی تھی۔

یوٹے برگ میں اب بھی اُس کی مانگ تھی — لیکن اس مانگ میں فرق تھا۔

وہ بہت مختلف بدن کی اور سفید بیڈ شیٹس کو بھی گرمی سے بھورا کر دینے کی صلاحیت رکھنے والی ایک آسٹرو منگولائڈ لڑکی تھی اور عام سویڈ لڑکیاں بہت بے ذائقہ اور ٹھنڈی تھیں... اسی لئے یونے برگ میں اب بھی اُس کی مانگ تھی۔

راؤنی اُسے واقعی دل سے چاہتا تھا، وہ پہروں متفکر بیٹھا داڑھی کھجلاتا رہتا۔

شاید انہی زمانوں میں مشائلہ سفید سفوف کی طرح مائل ہوئی اور اُن کی آمدنی کا بیشتر حصہ ادھر صرف ہونے لگا۔ راؤنی کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ اپنی سیاہ فام بیٹی کے لئے اور نہ اپنی جنگلی بیوی کے لئے۔ وہ بھی راتوں کو دیر سے آتی اور جب بھی آتی اُس کے ہمراہ "راؤنی میٹ مائی فرینڈز —" عجیب قماش کے نوجوان ہوتے — وہ سفید سفوف کی آسان دستیابی کی کشش میں ہی ایک بار اکیلی پاکستان بھی گئی تھی۔

راؤنی ایک شام فکر مندی کی انہی سوچوں میں گم ٹیلی ویژن کی خالی سکرین کو تک رہا تھا جب مشاہد کا فون آگیا — میں یونے برگ میں ہوں۔

برگیتا کے سامنے جب وہ نیچے ڈرائنگ روم میں آئی، شیشے کی دیوار کے آگے سے گزر کر اُس کے سامنے آئی... تو وہ ٹھٹک گئی — اس کے سامنے ایک سچ تھا... اُسی رنگ اور نسل کا... وہی جس کی تلاش میں منطق الطیر کے پرندے نکلے تھے اور اُس سچ کی شکل بھی جیسی تھی۔ ہو بہو وہ آپ تھے جیسے آئینے کے مقابل ہوں اور برگیتا کے سامنے آئینہ ہی جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی تھی... کون آیا پہن لباس کڑے... کون آیا؟

جب اگلی شام پاپا راؤنی نے ایک ناپسندیدہ لہجے میں اُسے بتایا کہ مشاہد جو اُن کا عمر ہے اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو برگیتا کے سامنے ایک آئینہ تھا اور وہ اپنے آپ اس میں دیکھتی تھی اور ہمیشہ دیکھتے رہنا چاہتی تھی۔

شکر دوپہر کی خاموشی میں جب کھنکتی چوڑیوں کی آواز تادیر کھنکتی تھی لوگ منہ پر
ے ڈالے ٹاہلیوں کی چھاؤں میں الانی چارپائیوں پر گھوک سو رہے تھے اور کچے پکے
وں کی کھڑکیاں باہر کی لُو روکنے کے لئے کواڑ بند تھیں اور پھر بھی ان کے اندر منہ
ل کر سونے والوں کے کانوں میں خشک بے رنگ آسمان میں سیاہ ستارہ ہونے والی
ں کی چیرتی آوازیں ایک ناگوار ارتعاش کے ساتھ اُترتی تھیں۔

جوہڑ کی سطح پر کہیں کہیں کائی تھی جو گرمی کی شدت سے جیسے پہلو بدلتی ایک ناگوار
بنی تھی۔ پانیوں کی گدلاہٹ میں ایک گرم موٹائی تھی۔ کناروں پر کان بوٹی ہلتی تھی اور
ں کے کاسنی خوشنما پھول شکر دوپہر میں خوش تھے اور اُن پر ایک باریک گُتّی فضا میں جیسے
ی تھی لیکن ایک چھوٹے سے متحرک بادل کی طرح کبھی اس پھول پر کبھی بدبودار کائی

جوہڑ اپنے غلاظت بھرے وجود اور گہرے ٹھہرے ہوئے اندھے پانیوں کی نیم گرمی
کہ وہ پانی اُبلنے سے ذرا ادھر تھے تو یہ جوہڑ سطح پر ایک سٹل لائف تصویر کی مانند ٹھہرا
اور بے جان لگتا تھا سوائے کان بوٹی کے جو ہلتی تھی اور گُتّی کے جو رک رک کر اُڑتی

سب جدھر دیکھتے تھے برگیتا بھی ادھر دیکھتی تھی۔

اور سب جوہڑ کے کنارے سے ذرا دور جہاں خود رو بُوٹی پانیوں کو ڈھکنے میں ناکام
ی تھی وہاں دیکھتے تھے — اور دیکھتے دیکھتے ٹھہری ہوئی لُو سے لُوستے بدبودار پانیوں میں
کیچڑ کا ایک ہیولے سا باہر آیا — اور سب لوگ ذرا آگے ہوئے — برگیتا اور مشاہد
ا کھڑے رہے...

وہ گہرے پانیوں میں سے نکل کر بوٹی کو ہاتھوں سے پرے کرتا کیچڑ میں سے پاؤں
نکالتا باہر آیا تو اُس کے بدن پر جوہڑ کی تہہ کی تمامتر غلاظت اور گارا ایک رواں اور جاندار

اور نیم سیاہ لیپ کی صورت میں گرتا تھا۔ اُس کے نتھنوں، کانوں اور منہ میں سے گ
ایسے دھیرے دھیرے رس رہی تھی جیسے اُس کی رگوں میں خون کی بجائے کاموکی
جوہڑوں کا گارا گردش کرتا ہے۔ اُس نے اپنا دایاں ہاتھ فخر سے بلند کیا جس میں کانسی کا ا
کٹورہ تھا اور اُس میں سے بھی گارا گر رہا تھا۔

برگیتا نے اپنے چہرے کو جو گرمی کی شدت سے ہر لمحہ بھیگتا اور نچڑتا تھا ایک م
پھر پونچھا اور کانسی کے کٹورے سے نظر ہٹا کر مشاہد کی جانب دیکھا — مشاہد نے اثبات م
سر ہلایا۔

— بوڑھے بکو ساہ پکے کا اب سر ہلتا تھا اور وہ سر صرف ایک لحظے کے لئے ہلنا ت
موقوف ہوا جب اُسے بشیراں بی بی نے اپنے جہیز کے کٹورے کو جوہڑ میں سے نکالنے پر د
روپے کا نوٹ تھمایا۔ نوٹ اُس کی مٹھی میں آتے ہی گارا ہو گیا اور اُس کا سر پھر سے ہ
لگا۔

تماشہ ختم ہو گیا۔

جو ٹاہلیوں کے نیچے بچھی الانی چارپائیوں سے اُٹھ کر آئے تھے اور جو اپنے پ
گھروں کی نیم تاریک ٹھنڈک میں سے لُو ستی لُو اور خشک آگ برساتے آسمان تلے صرف
اس لئے آئے تھے کہ ایک مرتبہ پھر بکو ساہ پکے کا ساہ دیکھیں، واپس چلے گئے۔

کہیں اُن میں سے کچھ کو وہم تھا۔ کچھ کی خواہش تھی کہ اس مرتبہ بکو جوہڑ کے
اندر ڈبکی لگائے گا تو پھر اُبھرے گا نہیں — وہیں رہے گا۔ اور اُنہیں اس موقع پر موجود ہونا
چاہئے...

وہ اپنی آنکھوں پر سے کیچڑ کے لیپ کو سمیٹتا، لنگوٹ کو سنبھالتا اُدھر گلی کی جانب
ایک نابینا شخص کی مانند جا رہا تھا، اور کیونکہ اُس کی مٹھی میں دس روپے کا نوٹ تھا اور اس
کے سوا دنیا میں کوئی اور مذہب کوئی اور سچائی نہ تھی جب — برگیتا نے اُس کے کیچڑ
بھرے سوکھے سیاہ ٹہنی بازو پر اپنا ہاتھ رکھا — "ڈیڈی —"

"ہیں جی —" وہ ڈر گیا کہ شاید کوئی اُس کا نوٹ واپس لینے آیا ہے۔ اس نے
پپوٹوں پر سے گرتے اور اب گرمی سے تیزی سے خشک ہوتے کیچڑ کو پھر سے پونچھا اور اپنے
سامنے کھڑے ایک صاحب اور ایک بیگم صاحبہ کو دیکھا اور بیگم صاحبہ کا رنگ اگرچہ اُس
جیسا تھا لیکن اُن کا ہاتھ اُس کے بازو پر تھا... وہ سمٹ کر اور جھجک کر ذرا فاصلے پر ہو گیا~

تھا اور وہ بیگم صاحبہ تھیں... بیگم صاحبہ کا ہاتھ وہیں رہا اور جب اُس کے بازو سے، اس کے سمٹ کر پیچھے ہٹنے سے، الگ ہوا تو اُس پر بھی کثافت کا لیپ تھا۔

"آپ برکت مسیح ہو؟" مشاہد نے پوچھا...

بکّو یکدم انسان سے قدموں میں لوٹنے والا ایک جانور ہو گیا — آج تک جب بھی اُس سے یہ سوال پوچھا گیا تھا کہ کیا تم برکت مسیح ہو تو ہمیشہ اُس پر کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہوئی تھی... کسی چوری کے شک میں تھانے میں حاضری — پھر چھتر کُٹ اور مُک مکا — یا پھر چوہدریوں کی بیگار — یا پھر محکمہ ایکسائز والے... کہ پرمٹ پر شراب لے کر مسلمانوں کو بیچتے ہو — تو وہ ایسے تمام موقعوں پر قدموں میں لوٹنے والا جانور بن جاتا تھا صرف چاؤں چاؤں نہیں کرتا تھا باقی ہو بہو وہی بن جاتا تھا — نہ بنتا تو اتنے انصاف پرست معاشرے میں زندہ کیسے رہتا "ہاں مائی باپ... آہو جی... حکم حضور..." — چاؤں- چاؤں اس نے دونوں ہاتھوں سے گرتے ہوئے لنگوٹ کو تھام لیا جو گارے کی وجہ سے کھسک رہا تھا۔

برگیتا پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاید ایک خلائی مخلوق دیکھ رہی تھی جو کہیں ٹھنڈے ہوتے لاوے میں سے جنم لے کر پانیوں میں سے اُبھر کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی- گرم دوپہر میں شکر دوپہر میں اس کے سیاہ غلاظت بھرے بدن میں سے جیسے بدبو اور بھاپ اُٹھتی تھی... اوہ کرائسٹ یہ... یہ شخص... یہ کیچڑ — ہی ازمائی فادر... میرا باپ ہے — میرا وجود اس کے اندر کی نمی سے بنا ہے — میں اس کا حصّہ ہوں... اس کا — اوہ کرائسٹ-

بکّو ساہ پکّے کے دیہڑے میں کپاس کی من چھٹی کے ڈھیر تھے- ایک دیوار پر تازہ گوبر کے اُپلے تھوپے ہوئے تھے اور جو ایک کچی کوٹھڑی تھی اُس کے اندر وہ سب فرش پر — کچے فرش پر گڈمڈ سوئے ہوئے تھے —

اوئے اُٹھو — اوئے حرامیو اُٹھو — جیرے — بھجو — چنّی — دیکھو تو سہی کون مہمان آیا ہے... وہ سب بدبودار اور گندے چیتھڑوں میں اپنے بدنوں کو بیزاری سے جھلاتے اُٹھے اور انہوں نے نیند کی گھوک میں اپنے باپ سے ایسے لفظ کہے جو نہیں کہے جاتے۔

"بیگم صاحب —" بکّو نے ڈرتے ڈرتے کہا "تم سے ملنے آئی ہیں —"

برگیتا کی سانسوں کے آگے رکاوٹیں آنے لگیں، بدبُو اور بے چینی کی، اُبکائیاں

آنے لگیں... وہ کوشش کے باوجود اس ماحول میں زیادہ دیر ہوش میں نہیں رہ سکتی تھی اور اوہ کرائسٹ دے آر ڈرٹی....

"بیگم صاحبہ — تمہاری سسٹر ہیں —"

وہ درجن بھر تو ہوں گے۔ سب سے بڑا بال بچوں والا تھا اور اُس کے بال بچے بھی اِسی کوٹھڑی میں پسارے ہوئے تھے اور سب سے چھوٹا دس برس کا نہ تھا —

"اوئے سلامت — ایدھر آ"

سلامت ابھی تک اس میلے میں شامل نہیں ہو رہا تھا اور وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔

"صاحب جی —" وہ مشاہد کی جانب پلٹا "یہ... سلامت اور بیگم صاحبہ اکٹھے آئے تھے — سلام کر اوئے بیگم صاحبہ کو — سسٹر ہیں۔"

"سلام اے" اُس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور اپنی جانب دیکھنے والی بیگم صاحبہ کی نظروں کی تاب نہ لا سکا — یہ کیوں میری طرف ایسے دیکھتی ہے... بابے حرامی کا دماک خراب ہو گیا۔ کہتا ہے ہم اکٹھے آئے تھے — کہاں سے اکٹھے آئے تھے بھائی!

مشاہد بہت دیر سے صرف مشاہدہ کر رہا تھا "تمہیں وہ رات یاد ہے؟"

"آہو جی —" برکت مسیح اپنے جانور وجود سے واپس آ رہا تھا "اُس رات مینہ پانی بہت ہی زیادہ تھا — تو میری جنانی نے — یکدم اِکو واری تین نیانے جن دیئے — ایک تو باہر آتے ہی فوت ہو گیا مجھے یاد ہے جی — اور میری جنانی کا دودھ سوکھ گیا تو میں — کرایہ اُدھار لے کے لہور گیا سوڈن والے صاحب جی کے پاس — بھاگ لگے رہن انہوں نے یسوع کی بھیڑ کا ہاتھ پکڑ لیا..."

مشاہد نے سر ہلایا — جب صبح کا اُجالا ہوا تھا اور دونوں موم بتیاں اپنی بلند قامتی کو پگھل پگھل کر مختصر کرتی میز کی سطح پر آ کر بکھر چکی تھیں جب راڈنی کامونکی سے واپس آیا تھا — اُٹھو مشائلہ... انہیں دودھ پلاؤ — ساڈھا یسوع اَج آیا سی۔

لاہور واپسی پر وہ کامونکی ریلوے سٹیشن کے قریب سے ہو کر نکلے۔

ابا جی نے اخبار کھول رکھا تھا اور اُن کی اُنگلیاں اس پر گرفت نہیں کر رہی تھیں اور لرزتی تھیں... اسی سٹیشن پر —

باہر مت دیکھو —

ایک اور ٹرین بھی تھی جو کھڑی تھی۔

اک مریل سا کُتا اپنے وزن سے کہیں زیادہ کی کوئی شے گھسیٹتا آ رہا تھا اور اُس کا ایک چھوٹا سا سر اور دو خون آلود آنکھیں تھیں۔

دن بھی یہی تھے جب جوہڑوں میں سے بھی گرمی کی شدت سے بساند اُٹھتی ہے تو ہوا میں سے تو بُو اُٹھنی ہی تھی...

ایک سیاہ۔ ننگ دھڑنگ بچہ — سرخ رنگ کا بھاری کپڑا... پلیٹ فارم پر گھسیٹتا ہوا۔ اُس کے نین نقش آج پہچانے گئے تھے۔

"تھاکس اے میکے — بہت شکریہ" برگیتا نے سٹیئرنگ کو تھامے ہوئے اس کے اوپر ہاتھ رکھا اور اُسے دبایا اور تب وہ کامران کی بارہ دری کو دیکھ رہے تھے "میں آج کل ہو گئی ہوں۔"

"وَف — وَف" کتورا اپنی کمینی حیثیت سے بڑھ کر بلند آواز میں "وَف"
کرنے کی کوشش میں دوہرا ہو کر گرتا گرتا بچا۔

کالیے نے ٹھٹک کر پیچھے دیکھا۔

"اوئے برادر عزیز تو کہاں چلا آ رہا ہے۔ اگر چلا ہی آیا ہے تو ذرا دیکھو اور اپنی چشم
آنکھوں سے ریت کے ذرّوں میں سے کسی ایک ذرّے کو فوکس میں لا کر دیکھو جو کرنیں
جذب ہو چکی ہیں اُن کی مدھم لَو دیکھو جو... ہم انسان نہیں دیکھ سکتے — لیکن تو دیکھ برادر
عزیز"

سورج کب کا ڈاؤن اینڈ آؤٹ ہو چکا تھا لیکن ریت کے ذرّوں میں — لانا
پھوگ، کترن۔ کھپ، کھار اور چھپری کی جھاڑیوں میں جو روشنی جذب ہوئی تھی اب اُن
کی نس نس میں سے پھوٹتی تھی۔ بہت ہلکی لَو کے ساتھ — افق پر کیکر کے درختوں کی
جھالر شاخوں کے اُوپر ایک یخ سرخ تمازت پھیلی ہوئی تھی جیسے صحرا کے اندر کہیں اندر
آگ پوشیدہ ہو جیسی دہکتے اُپلوں میں ہوتی ہے اور اُس کی سرخی آسمان پر جھالر شاخوں کو
جو سیاہ ہو رہی تھیں اُن کے اُوپر پوچا پھیرتی ہو — یہ عجیب ناواقف ناقابل اعتبار روشنی
تھی جو ڈیرا اور قلعے کی بلند اور کچی دہشت دیواروں بلکہ اہراموں سے نیچے آتی تھی اور
جامع مسجد کی ویرانی میں سفر کرتی ہوئی اُس کے قدیم سنگ مرمر کے ناآشنا جھروکے کی شکستہ
جالیوں میں ذرا کی ذرا رُک کر ایک نظر ڈیرا اور کے بڑے چوبی دروازے پر ڈال کر اُترتی
تھی — اور اُترتی تھی جھروکے سے دکھتے بازار میں، تو اُس ریت اٹے کچے کمروں۔ اینٹوں
کی محرابوں اور ڈھئے ہوئے مٹی کے ستونوں کے بازار میں — اور وہاں صرف کچے کھنڈر
تھے اور صرف ایک دو دوکانیں کھلتی تھیں جن میں جدید مشروبات کے کریٹ، پوٹیٹو چپس
اور بسکٹوں کے علاوہ مرونڈے اور دالیں تھیں اور ہاں پنکچر لگانے کا بھی خاطر خواہ انتظام تھا
— لیکن اب اس گہری سرخ شام میں وہ دوکانیں بند تھیں۔ تو اُس بازار میں جو یورپین

بڑکی تصاویر میں ٹڈل ایجز کا ایک فراموش شدہ بازار پینٹ ہوتا تھا... وہ روشنی — اگر اسے صرف روشنی کہنا جائز ہے تو... کہ اُس میں کوہ طور کی الوہیت تھی — تو وہ روشنی ان ریتلے، کچے، مسمار ہوتے بازار میں تادیر ٹھہرتی تھی اور وہیں دم توڑتی تھی... کالیا اس ان میں ایک مسافر کی تصویر جو ابھی ابھی تھکا ماندہ صحرا پار کر کے یہاں پہنچا تھا۔ ٹھکانا ہو کرتا... اپنے قدم گھسیٹتا حالانکہ اُس کا ٹھکانہ تھا ریت میں قدم گھسیٹتا چلتا تھا جب اُس کے برادر عزیز نے "وَف" کیا تھا اور وہ ٹھٹھک گیا تھا۔

وہ دونوں — ایک کُتورا اور ایک انسان بہت دیر تک — اُس روشنی کے اسیر رہے جسے صرف روشنی نہیں کہا جا سکتا — اتنی دیر جتنی دیر میں انسان نے چار پاؤں کی بجائے دو پاؤں پر چلنا سیکھا اُتنی دیر اسیر رہے۔

کیمپ کے جنریٹر کی بھدی آواز صحرا کی خاموشی کی بے حرمتی کرتی ہوئی یہاں تک آ رہی تھی اور کبھی کبھار ہوا کے شانوں پر کسی چولستانی گویے کی تان اس خاموش ریتلے اور کچے ناقابل بیان بازار کے کھنڈروں تک آ جاتی جس میں کالیا قدم گھسیٹتا چلتا تھا۔

"دیکھ برادر عزیز — دیکھ" وہ جھک کر پھر کُتورے سے مخاطب ہوا" میں تمہارا بہت شکرگزار ہوں... تم میرے ساتھ تین مہینے مردان جیل میں رہے — تم واقعی برادر عزیز ہو — اسی لئے تو میں یہاں آیا ہوں — جیل کے بعد مجھے صحرا چاہئے تھا۔"

آج شام عباسیوں کے شاہی قبرستان میں بھی ایک اَن دیکھی اور ناواقف روشنی تھی جو خواتین کے نازک مدفنوں پر ایسے اثر انداز ہوتی تھی جیسے اُس میں روح ہے جو ستان کے دل میں ایستادہ ایک برباد اور بے آباد لینڈ سکیپ کی ریتوں کے درمیان —، ناپوشیدہ رہنے کی آرزو کرتے مقبروں میں دبے پاؤں چلتی تھی۔ اس میں ہمیشگی کی ایک لیت تھی کہ مقابر بالآخر کھنڈر ہوں گے، ریت میں ریت ہوں گے لیکن یہ جو ناواقف روشنی ہے یونہی دبے پاؤں چلتی رہے گی۔

ایک بڑے مستطیل شکل کے فانوس زدہ بلند ہال میں پہلو بہ پہلو نوابین کی قبریں نواب فلاں — نواب — ڈسٹ ٹو ڈسٹ اینڈ ایشز ٹو ایشز اور اَینڈ رزلٹ کیا اور اَینڈ رزلٹ میں — اُس شاہی تدفین گاہ کے آخر میں ایک قبر کی جگہ خالی تھی... کھدی ہوئی تھی صرف سنگِ مرمر کی سِل اُٹھا کر مناسب نواب کو اس کے اندر رکھنا تھا پھر ڈھک دینا تھا... مٹی مٹی میں اور راکھ — راکھ میں۔